آج کی پاکستانی عورت کے مسائل-فکرِ اقبال کی روشنی میں

ڈاکٹر روبینہ ترین*

Abstract:
Status of woman in any society determines the conduct and civilized level of any polity. In Pakistan society a class of woman deem suitable paradigm for itself which is popular in west. Whereas in the Muslim world women are standing on the cross road in the backdrop of clash of civilization. In this article the socio cultural context of women with serious problems has been raised in the light of thought and art of poet of the east Allama Muhammad Iqbal. In this paper the evolution of Iqbal's thought has been raised regarding the role of woman in a society which is otherwise conservative but keeps high moral ideals regarding a civilized and cultured society allowing the woman to discover its ego. (potential of self).

جب ہم پاکستانی سماج میں عورت کے حوالے سے کوئی بات کرتے ہیں تو ہمیں تین بنیادی حقائق کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

۱۔ کہ ہمارا معاشرہ ایک طبقاتی معاشرہ ہے اور عام طور پر شہروں اور دیہاتوں کی تقسیم میں ہمارے دیہات کا نچلا اور کمزور طبقہ اکثریت ہی میں ہے جہاں نہ صرف اُن کی زندگیوں کے فیصلے سردار، وڈیرے، پنچایتیں یا جرگے کرتے ہیں بلکہ ان کی اس اذیت ناک زندگی کے بدلے میں آخرت کی ابدی دنیا کا ان کے عقیدے کے مطابق وعدہ کیا گیا ہے اس کے خدوخال ابھارنے کا حق بھی اُس طبقے کو حاصل ہے جو لڑکیوں کے سکولوں کو بھی نہیں مانتا۔

۲۔ اہم بات یہ ہے کہ پاکستان میں ریاکاری نے برس ہا برس زعماء کے پیغامات، نصاب، جوشِ خطابت یا مقدس تہواردن کے ایڈیشنوں کی صورت میں جو فصل بوئی تھی آج ہم بھیانک طریقے سے اُسے کاٹ رہے ہیں۔

۳۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ فوجی مداخلتوں، آئین توڑنے والوں اور اپنی مرضی کے سیاستدان اور سیاسی جماعتیں تخلیق کرنے والوں نے رفتہ رفتہ تشدد اور ڈھٹائی کو ظلم پر مبنی نظام کا پہلا اور آخری حربہ بنا دیا۔

* صدر شعبہء اردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

چنانچہ ان تینوں حقائق کے تناظر میں آج کی عورت کو دیکھا جانا چاہیے میں گذشتہ ایک عشرے کے اندر ہونے والے محض چند واقعات کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جس نے عالمی سطح پر ہمارے نظام کی سفا کی اور ظلم کو بے نقاب کیا میں جس یونیورسٹی میں پڑھاتی ہوں یا اس کے قریب ہی بہاولپور یونیورسٹی کو جسے پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم نے ۱۹۷۵ء میں اس اُمید کے ساتھ دائم کیا تھا کہ اسی دانش گاہ کے ذریعے تعلیم اور شعور کی ایسی روشنی پھیلے گی کہ اس خطے میں بہت بڑی تبدیلی آئے گی مگر وہ نواب پور میری یونیورسٹی سے محض چار کلو میٹر دور ہے جہاں عورتوں کا برہنہ جلوس نکالا گیا تھا اور مختاراں مائی کا گاؤں میری یونیورسٹی سے محض ۳۶ کلو میٹر دور ہے جہاں پنچایت نے فیصلہ کیا کہ جس کم سن لڑکے نے مبینہ طور پر ایک سیاسی شخصیت کے کارندے کی بہن کو چھیڑا تھا اس کی سزا میں اُس لڑکے کی بہن مختاراں مائی کی اجتماعی بے حرمتی کی جائے۔ اسی طرح یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ نواب اکبر خان بگٹی کی شہادت پر منتج ہونے والے المیے کا آغاز ڈاکٹر شازیہ کی بے حرمتی سے ہوا تھا جس میں فوج کے ایک اعلیٰ افسر کا بیٹا ملوث تھا اسی طرح سندھ کے بڑے وڈیروں اور مخدوموں نے اپنی جائیدادیں بچانے کے لئے اپنی بہنوں بیٹیوں کی قرآن سے شادیوں کا جو سلسلہ قائم کیا یا حلالہ کو کاروبار بنانے والوں اور عورت کے قتل کو واجب قرار دینے والوں نے عورت کی گواہی کو بھی آدھا کر دیا۔ ملک کے چاروں صوبوں میں خواتین کے ساتھ کم وبیش ایسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ سندھ ہو یا پنجاب بلوچستان ہو یا فاٹا کے علاقے ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ چند طاقتور افراد کی نمائشی بیگمات یا اپنے حقیقی سماج میں ظلم کی چکی میں پسنے والی عورتوں سے بے نیاز چند چمکیلی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی خواتین میڈیا پر آ کر وقتاً فوقتاً ٹشو پیپر سے اپنی مفروضہ نم ناک آنکھوں کے گوشے بڑی احتیاط سے صاف کرتی ہیں کہ ان کے بس میں یہ دکھائی نہیں دیتا کہ وہ اس نظام میں کوئی تبدیلی لا سکیں۔

ہمارے لئے بہت عرصے تک یہ بات قابل فخر رہی کہ ہمارے وطن کا خواب ایک فلسفی شاعر نے دیکھا تھا اور جس نے اس کا اظہار اس کے قیام سے سترہ برس پہلے خطبہ الٰہ آباد میں کیا تھا کہ گذشتہ ایک ہزار برس میں ہندوستان میں بہترین اسلامی ثقافتوں کا جو تال میل ہوا ہے۔ اسے اجتماعی زندگی کا جوہر بنا کر ہم ہندوستانی یا مسلم اکثریتی علاقوں میں ایک مثالی سماج پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر افسوس آج اس خواب کی تعبیر بہت دردناک ہو چکی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انقلاب آفریں اقبال کی فکر کلام اور اس کے نام پر قائم اداروں پر وہ مجاور مسلط ہیں جو مختاراں مائی کی پنچایت کے پنچوں سے مختلف نہیں اور یہ اپنے دل سے سمجھتے ہیں کہ لڑکیوں کے سکولوں کو بموں سے اُڑانے والے چار چار شادیاں بیک وقت کرتے اور چار چار کو بیک وقت طلاق دینے والے غیرت کے نام پر عورتوں کو اذیت دے کر

ہلاک کرنے والے سچ مچ مجاہدینِ اسلام ہیں اور اقبال جیسے عظیم مفکر انہی کے ذریعے دنیا بھر میں اسلام کو پھیلانا چاہتے تھے حالانکہ علامہ اقبال ایک ایسے شاعر اور مفکر کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی شاعری اور فکر میں ایک وقت میں صرف مسلمان قوم سے مخاطبت کے باوجود وسیع النظری، بلند نظری اور ہمہ گیریت موجود ہے۔ان کی فکر کو تاریخی یا جغرافیائی حد بندیوں میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ اقبال کا پیغام محض برصغیر پاک و ہند کے لوگوں کے لئے نہیں تھا بلکہ انہوں نے زندگی کے جن پہلوؤں پر قلم اٹھایا تھا ان کا محور نوجوان طبقہ شہری، دیہاتی، دہقان، مزدور گویا تمام مرد وزن ہیں۔علامہ اقبال نے ایک مفکر عصر کی طرح اپنے اردگرد ماحول کا بخوبی مطالعہ کیا، انسانی ماحول و مسائل کا تجزیہ کیا تھا، مشرق و مغرب کے فلسفیانہ سرمائے سے استفادہ کیا تھا اور اپنے فلسفیانہ ذہن دردمند قلب اور قرآنی بصیرت کے ذریعے پوری انسانیت کے لیے اپنی فکر کو پیغامِ جاوداں بنا دیا۔ اُنہیں اس بات کا بھی بخوبی احساس تھا کہ کسی معاشرے کی تہذیبی، ثقافتی اور ذہنی بلندی کا اندازہ اُس سماج میں عورت کے وجود اور حقوق کے احترام سے لگایا جاسکتا ہے وہ کہتے ہیں:

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مُشتِ خاک اسکی — کہ ہر شرف ہے اس دُرج کا دُرِّ مکنوں
(عورت، ضربِ کلیم)

اسلام تہذیبی وتمدنی زندگی میں عورت کے خاص مقام ومرتبے کو تسلیم کرتا ہے۔قرآن نے ''ھُنّ لباس لکم وانتم لباس لھن'' (وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو) کہہ کہ عورت اور مرد کو معاشرتی وتہذیبی اغراض میں ایک دوسرے پر منحصر اور مددگار ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ اقبال عورت اور مرد کی صلاحیتوں کو ایک دوسرے کا تکملہ قرار دیتے ہیں۔ تہذیب وتمدن کی تکمیل کے لیے دونوں کا وجود ضروری ہے، تہذیبی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ دونوں اپنے اپنے وظائف وفرائض اپنی اپنی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سرانجام دیں۔اور ایک دوسرے کے مددگار بنیں۔

اقبال کے نزدیک اسلام میں عورتوں پر سیاسی قومی زندگی میں حصہ لینے کے معاملے میں بھی کوئی پابندی نہیں۔صرف حد اعتدال اور نفسیاتی وفطری تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر اسلام میں عورتیں اپنے بعض بنیادی فرائض اور حدود کا خیال رکھتے ہوئے زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لے کر تہذیبی ارتقا میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں اور جہاں تک بنیادی ذمہ داریوں اور فرائض سے عہدہ برا ہونے کے تقاضے کا تعلق ہے تو یہ تقاضا تو مردوں سے بھی ہے۔مگر اسے کیا کیجئے کہ ہمارے سماج کو تخلیقیت سے محروم کرنے والے بڑے جذباتی انداز میں

اقبال کا یہ شعر پڑھتے نظر آتے ہیں:

؎ ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار (ہُنر وران ہند، ضربِ کلیم)

حالانکہ یہاں اقبال عورت تو لذتیت کا حیلہ بنانے والے طرزِ عمل پر اعتراض کر رہے ہیں وگرنہ وہ بطور شاعر جانتے ہیں کہ کوئی بلا شبہ عظیم سماجی وفکری مقاصد کے حصول کے لئے ہی شاعری کرے تب بھی اُس کے شاعرانہ رموز وعلائم، تشبیہاتِ استعارات اور تمثال آفرینی کے تمام تر نظام میں نسائی جمالیات ہی عکس ریز ہوگی۔ اس کی ایک نمایاں مثال اسرارِ خودی میں اُس مقام پر دیکھی جاسکتی ہے جب اقبال اپنے معاصر شاعروں کو عجمی روایت کی بجائے عربی یا حجازی روایت سے اخذِ فیض کا مشورہ دیتے ہیں تو کہتے ہیں:

؎ دل بہ سلمائے عرب باید سپرد

اقبال کی شعری لفظیات ان کے شخصی تجربات ومحسوسات کے ساتھ ساتھ انگریزی میں رومانوی شاعری کے تخلیقی مطالعے کی بازگشت کی مظہر ہیں، چمکیلی اور تاباں تمثالیں اقبال کی منظومات میں ایسے آئیں کہ عمر بھر آفتاب، مہتاب، ستارہ، جگنو، شمع، صبح اور دریا وغیرہ ان کے شعری اُفق پر چھائے رہے، 'محبت'، 'حقیقتِ حسن'، 'پیام'، 'حسن وعشق'، ''۔۔۔کی گود میں بلی دیکھ کر'، 'وصال'، 'سلیمیٰ'، 'عاشقِ ہرجائی'، 'جلوۂ حُسن'، اور بالخصوص 'ایک شام' (دریائے نیکر، ہائیڈل برگ کے کنارے پر) جیسی نظموں کی فضا پر عورت اور اس کا تصور ایک تخیل زا، خیال افروز بلکہ حسی فیض رساں محرک کے طور پر نظر آتا ہے، موخر الذکر نظم کی حقیقی معنویت کا اندازہ ایما ویگے ناسٹ کے نام اقبال کے گرم جوش جذباتی مکاتیب سے ہوتا ہے۔۔۔اقبال کے اسی دور کی نظم ''زہد ورندی'' (بانگِ درا) بھی اس حوالے سے اقبال کی شاعرانہ شخصیت کے تشکیلی اجزاء کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے:

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا — ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل — مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حُسن فروشوں سے نہیں ہے

عورت کو کوئی نہ کوئی درجہ زمانہ جاہلیت میں یا اُن معاشروں میں دیا جاتا رہا جہاں ذہنی، معاشی، سماجی ومعاشرتی پسماندگی تھی لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ جہاں اُس کے شعور میں اضافہ ہو رہا ہے وہاں اُس نے اپنی تعلیم، محنت، جدوجہد اور لگن کے باعث مرادانہ سماج کے اس روّیے کو بدلنے کی کوشش کی ہے، علامہ اقبال نے مشرق ومغرب کے

معاشروں کی صورت کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ اُن سے میل جول بھی تھا وہ جانتے تھے کہ مغرب کی عورت کا اس کے معاشرے میں کیا کردار ہے اور مشرق کی عورت سے کیا تقاضا کیا جاتا ہے، اس لئے ہمیں فطری دلچسپی ہوسکتی ہے کہ فکرِ اقبال کی روشنی میں اقبال کا مشرقی عورت یا مسلمان عورت کے حوالے سے مثالی تصور کیا ہے؟ اس سلسلے میں اقبال کے کلام کے ساتھ ساتھ مکاتیب کا مطالعہ ایسے نکات سامنے لاتا ہے، جو بادی النظر میں تضاد کا منظر نامہ بناتے ہیں، مگر عورت کے حوالے سے اقبال کی شخصیت اور فکر کی تفہیم میں مدد دیتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آج پاکستانی اور مسلم معاشرے میں تنگ نظری اور قدامت پسندی سے نبرد آزما عورت کی جدوجہد کو نئے معانی اور تقویت ملتی ہے۔

تہذیب و معاشرت کی بنیادی اکائی خاندان ہے۔ اقبال کے نزدیک ''خاندانی وحدت'' ''بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا جزو اعظم ہے۔''[1] اگر یہ وحدت منتشر ہو جائے تو پورا معاشرہ منتشر ہو کر رہ جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خاندان ایک ایسا ادارہ ہے جو انسان کے روّیے اور طرزِ عمل کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔

علامہ اقبال عورت کی عظمت کے قائل تھے ان کے نزدیک یہ عطیۂ قدرت ہے۔ عورت کسی بھی معاشرے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے، عورت کے بارے میں علامہ اقبال کے کلام میں جذباتی سے زیادہ فکری انداز ملتا ہے۔ عورت ان کے نزدیک صرف حُسن مجسمہ یا جذباتی تسکین کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ سماج میں اُس کی اور حیثیتیں بھی ہیں۔ اقبال نے یہ انداز اُس وقت اختیار کیا جب انہوں نے ایک رومانوی شاعر کی جگہ سوشل ریفارمر کا منصب سنبھالا تو انہوں نے اپنے حُسن سے متاثر ہونے، عشقیہ اور رومانوی جذبات کو ایک خاص رُخ دیا، انہیں احساس تھا کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک سماجی و فکری مصلح کی ضرورت ہے۔ انہوں نے بطور شاعر بعض نجی و شخصی اکساہٹوں پر قابو پایا اور حالی کی اس بات کو پیش نظر رکھا کہ

ع اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی عزت تم سے ہے

چنانچہ اقبال کی شاعری میں ہندوستانی معاشرے اور تہذیب میں عورت کی مختلف حیثیتیں نمایاں ہوئیں اور اب وہ محبوب سے زیادہ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے روپ میں مقدس کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ اقبال کے کلام کو دیکھیں تو ''ضربِ کلیم''، ''جاوید نامہ'' اور ''بالِ جبریل'' میں عورت کو اس کے فرائض اور حسّیات کا احساس دلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت کا اوّلین منصب لذتِ تخلیق ہے:

راز ہے اس کے تپ غم کا یہی نکتہ شوق آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات　　گرم اسی آگ سے ہے معرکہ بود و نبود

(عورت، ''ضربِ کلیم''ص:۱۰۹)

علامہ کے نزدیک عورت سماج میں آنے والی نسلوں کی خالق ہوتی ہے۔''امومیت'' اس کا تمدنی فرض ہے۔اچھے انسان پیدا کرنا، بچوں کی تعلیم وتربیت، ان کے خیالات کی اصلاح اوران کے عقائد کی تشکیل میں ماں کا اہم کردار ہوتا ہے۔عورت کے فطری فرائض، مرد وعورت کا تعلق، نوع انسانی کی بقا کا انحصار ماؤں پر ہے اور یہ سب عین اسلام کے مطابق ہے۔''مثنوی اسرار ورموز'' میں یہ عنوان ''در بیان معنی ایں کہ بقائے نوع از امومت است'' و''حفظ واحترام امومت اسلام است'' عورت ومرد کی رفاقت کے حوالے سے اہم ہیں اور یہ شعر:

نغمہ خیز از زخمۂ زن، سازِ مرد　　از نیازِ او دوبالا نازِ مرد

پوششِ عریانیِ مرداں زن است　　حُسنِ دل جُو عشق را پیراہن است

(ص:۱۴۹)

اقبال عورت کا شرف ''امومیت'' کو برقرار دیتے ہیں، اُن کے نزدیک اس صفت کی وجہ سے وہ تصویر کائنات میں رنگ بھرتی ہے۔اسی کے شعلوں سے حیات کے اسرار ورموز کھلتے ہیں اور لذت تخلیق سے آشنا ہوکر ہی گوہر سامنے لاتی ہے:

آغوش صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے　　وہ قطرۂ نیساں کو بنتا نہیں گوہر

عورت کے لئے اقبال تعلیم بھی ضروری قرار دیتے ہیں کہ وہ بطور ماں دنیا کے ہر بڑے فلسفی، مصلح اور تخلیق کار کی تربیت کرتی ہے۔

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن　　اسی کے شعلہ سے پھوٹا شرارِ افلاطوں

(عورت، ''ضربِ کلیم''ص:۱۰۶)

اقبال عورت کی سماجی اور معاشی حیثیت سے انکار نہیں کرتے لیکن ان کے نزدیک ''امومت'' اتنی بڑی ذمہ داری ہے اور اتنی بڑی عظمت ہے کہ اگر عورت محض اپنی مامتا یا امومت ہی احسن طریقے سے پورے کرلے اور اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں حصہ نہ لے تو بھی اس کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔جب اقبال مغربی عورت کو اس تخلیقی قوت سے عاری یا بانجھ دیکھتے ہیں تو اور بھی شدت کے ساتھ امومت کی عظمت واہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ان کے نزدیک اگر عورت کے بطن سے حسین جیسا محض ایک سچا اور انقلابی شخص ہی پیدا ہوجائے تو

گویا عورت نے اپنے منشائے وجود کو پورا کر دیا۔ محض یہی اس کی عظمت کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے اقبال چاہتے ہیں کہ عورتیں زندگی کے مختلف شعبوں میں ضرور کام کریں لیکن اپنے فرائض امومت سے غفلت نہ برتیں

تمدنی حالات کے بدلنے کے ساتھ مرد اور عورت کے کردار (Role) میں بھی
تبدیلیاں آ جاتی ہیں البتہ عورت اپنی بنیادی ذمہ داریوں سے پہلو تہی نہیں کر سکتی
اس کی ثانوی ذمہ داریوں میں تبدیلیاں آتی رہیں گی۔۔۔ اقبال بحیثیت
انسان عورت کی عظمت، اہمیت اور اس کے حقوق کے معترف تھے وہ عورت کے
مفاد ہی میں اس کی نسوانیت کو محفوظ رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔۔۔'' [۲]

اقبال آزادی، ترقی اور شرف کے قائل تو دکھائی دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ یورپ کے تصوراتِ آزادیِ نسواں کو بھی ناپسند کر رہے ہیں۔ اُسے تہذیب و معاشرت کے لئے ''مرگ'' قرار دیتے ہیں۔ کئی مواقع پر علامہ نے مغربی تہذیب اور ان کی صرف دنیاوی تعلیم کو عورت کے لئے خطرہ قرار دیا:

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگِ امومت ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن کہتے ہیں اُسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لئے علم و ہنر موت
(عورت اور تعلیم ''ضربِ کلیم''، ص:۱۰۸)

یا

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے ہند و یوناں جس کے ہیں حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال مرد بیکار و زن تہی آغوش
(ایک سوال ''ضربِ کلیم''، ص:۱۰۴)

کلام اقبال کی روشنی میں عورت کی نمائندگی اور مثالی عورت کا تصور حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا کردار ہے جو مثالی بیٹی، بیوی اور ماں ہے۔ آپ کی مقدس و معصوم سیرت و کردار، اطاعت، سادگی، جفاکش اور ایثار پسندی کے لئے اقبال کا یہ مصرعہ یا اُن کی پوری شخصیت کو سامنے لاتا ہے:

ع آسیا گردان ولب قرآں سرا

''جاوید نامہ'' میں شرف النساء[۳] کے کردار میں اُس کی موت کے وقت جو اشعار ہیں وہ بھی ایسی عورت کا تصور سامنے لاتے ہیں جو اقبال کے نزدیک اس سماج میں بھرپور کردار ادا کرتی ہے:

بر لب او چوں دمِ آخر رسید — سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید
گفت ''اگر از راز من داری خبر — سوئے ایں شمشیر و ایں قرآں نگر
ایں دو قوت حافظِ یک دیگراند — کائناتِ زندگی را محور اند
اندریں عالم کہ میرد ہر نفس — دخترت را ایں دو محرم بود و بس
وقتِ رخصت با تو دارم ایں سخن — تیغ و قرآں را جُدا از من مُکن
دل بآں حرفے کہ می گویم بنہ — قبرِ من بے گنبد و قندیل بہ

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربتِ مارا ہمیں ساماں بس است

اقبال کی شاعری میں عورت کا جو تصّور پیش کیا گیا ہے، وہ ایک مشرقی عورت کا تصور ہے جو کہ ان کے نزدیک اعلیٰ معاشرتی و سماجی اقدار، بلند اخلاق اور مذہبی روایات کی پاسداری کی امین ہے۔ اس سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ اقبال عورت کو گھر کی چار دیواری میں مقید کرنا چاہتے ہیں۔ مرد اور عورت کو ایک دوسرے سے دور رکھ کر عورتوں پر مردوں کی فوقیت چاہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اقبال جب خود کو قوم کے ایک رہنما اور مفکر کے طور پر پیش کرتے ہیں تو اُن کے نظامِ فکر میں عورت کا مثالی کردار ایثار، اصلاح، تربیت اور پاکیزگی سے عبارت ہے، جبکہ اقبال کے اندر کا انسان اور شاعر اُن کی ذات اور تخلیقی اظہار میں زندہ رہا۔ یہاں میں اقبال کے خطوط میں سے وہ چند مثالیں دیتی ہوں جو اُن کے کردار کے اس پہلو کو اضح کرتی ہیں کہ وہ عورت کے حوالے سے کیا تصور رکھتے تھے۔

اقبال نے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۵ء کو لاہور سے ایک خط لکھا اگرچہ خط طویل ہے تاہم اس کا ایک حصہ خاص طور پر عورت کے حوالے سے اہم ہے، لکھتے ہیں کہ:

> ''لندن میں ایک انگریز نے مجھ سے پوچھا کہ تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا ''ہاں، تیسرا حصہ مسلمان ہوں''۔ وہ حیران ہو کر بولے ''کس طرح؟'' میں نے عرض کی کہ رسول اکرمؐ فرماتے ہیں مجھے تمہاری دنیا سے تین چیزیں پسند ہیں نماز، خوشبو اور عورت۔ مجھے ان تینوں میں سے صرف ایک پسند ہے مگر اس تخیل کی داد

دینی چاہیے کہ نبی کریمؐ نے عورت کا ذکر دو لطیف ترین چیزوں کے ساتھ کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ عورت نظامِ عالم کی خوشبو ہے اور قلب کی نماز۔''[۴]

اقبال مولوی انشاءاللہ خان کے نام ایک خط میں عدن سے سویز کے سفر کے حالات جو کہ بحری جہاز پہ کیا تھا، لکھتے ہیں کہ

''یہاں جو پہونچا تو ایک اور نظارہ دیکھنے میں آیا۔ تختہ جہاز پر تین اطالین عورتیں اور دو مرد وائلن بجا رہے تھے اور خوب رقص و سرود ہو رہا تھا ان عورتوں میں ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ چودہ سال ہوگی نہایت حسین تھی۔ مجھے دیانت داری کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس کے حُسن نے تھوڑی دیر کے لئے مجھ پر سخت اثر کیا، لیکن جب اس نے ایک چھوٹی سے تھالی میں مسافروں سے انعام مانگنا شروع کیا تو تمام اثر زائل ہوگیا کیونکہ میری نگاہ میں وہ حُسن جس پر استغنا کا غازہ نہ ہو بدصورتی سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔''[۵]

سیّد محمد تقی شاہ جو مولانا سیّد میر حسن کے بیٹے تھے اور اقبال کے بچپن کے دوست بھی انہیں خط لکھتے ہوئے ایک طوائف امیر بیگم۔[۶] کے متعلق اپنے وہ جذبات چھپا نہیں سکے، جوان کے نوجوانی کے تجربات کے غماز ہیں، مکتوب پر تاریخ نہیں، مگر قیاس کیا گیا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں لکھا گیا۔

''امیر کہاں ہے خدا کے لئے وہاں ضرور جایا کریں مجھے بہت اضطراب ہے خدا جانے اس میں کیا راز ہے جتنا دور ہو رہا ہوں، اُتنا ہی اس سے قریب ہو رہا ہوں۔''[۷]

اقبال کی ازدواجی زندگی اور خاص طور پر پہلی بیوی اور اُن کی اولاد سے اقبال کا رویہ ایک مرتبہ پھر اُن کی بڑی بہو رشیدہ بیگم کی کتابوں کے باعث زیر بحث ہے، ایک خیال یہ ہے کہ اُن کے متمول پس منظر کے سبب شیخ عطا محمد یہ شادی کرانے اور پھر بگاڑ پیدا کرنے میں پیش پیش تھے۔ بہرطور اقبال کا اپنی بیوی سے متعلق ناپسندیدگی کا اظہار عطیہ فیضی کے نام ۹/اپریل ۱۹۰۹ء میں لکھے گئے ایک خط میں واضح ہے، لکھتے ہیں:

''مجھے اپنے بھائی ایک طرح کا اخلاقی قرضہ ادا کرنا ہے جو زنجیر پا بنا ہوا ہے، میری زندگی حد درجہ تلخ ہے۔ وہ مجھ پر میری بیوی مسلط کر رہے ہیں۔ میں نے

اپنے والد صاحب کو لکھ دیا ہے کہ انہیں میری شادی ٹھہرانے کا کوئی حق نہ تھا۔ بالخصوص جب کہ میں نے ایسے کسی کو حبالۂ عقد میں داخل ہونے سے دوٹوک انکار کر دیا تھا۔ میں اس کا نان نفقہ برداشت کرنے کو تو ضرور آمادہ ہوں لیکن اسے اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو اجیرن بنانے کے لئے قطعی تیار نہیں ہوں۔ ایک انسان ہونے کے ناطے میرا بھی خوشی پر حق ہے۔ اگر سوسائٹی یا نیچر مجھے اس سے محروم کرتی ہے تو میں دونوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہوں اس کا واحد علاج یہی ہے کہ میں اس بد بخت ملک کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دوں یا پھر شراب میں پناہ ڈھونڈوں جو خودکشی کو آسان تر بنا دیتی ہے۔''[۸]

۲۶/اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں ہیں۔ تیسری بیوی آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد کی۔ ضرورت نہ تھی مگر یہ عشق و محبت کی ایک عجیب و غریب داستان ہے۔ اقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرت ناک ثابت قدمی کے ساتھ تین سال تک اس کے لئے طرح طرح کے مصائب اُٹھائے ہوں، اُسے اپنی بیوی نہ بنائے۔ کاش! دوسری بیوی کرنے سے پیشتر یہ حال معلوم ہوتا۔ غرض کہ مختصر طور پر یہ حالات ہیں جو مجھے بسا اوقات مزید دوڑ دھوپ کرنے پر مائل کر دیتے ہیں۔''[۹]

ڈاکٹر سعید اختر درّانی نے جرمنی میں اقبال کے قیام، ایم۔اے کے لئے کیمبرج میں پیش کئے جانے والے تحقیقی مقالے کے میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں پی ایچ ڈی کے لئے پیش کئے جانے والا علمی تنازعے اور اقبال کا جرمن زبان کی ٹیچر مس ایما ویگے ناسٹ سے گرم جوش جذباتی لگاؤ کا تفصیل سے ذکر اپنی کتاب ''اقبال یورپ میں' کیا ہے، انہوں نے مس ایما کے نام اقبال کے مکتوبات کا ترجمہ بھی کیا ہے، جو سیّد مظفر حسین برنی نے کلیاتِ مکاتیب اقبال (جلد اوّل) میں شامل کئے ہیں۔

''ویگنیاسٹ، عزیزۂ من فرائیلائن ویگے ناسٹ۔

یہ آپ کا بڑا کرم تھا کہ آپ نے (خط) لکھا، لیکن بہت مختصر۔ میں اُس وقت تک

آپ کو نہیں لکھوں گا، جب تک آپ مجھے وہ خط نہیں بھیجتیں، جو آپ نے پھاڑ ڈالا ہے۔ یہ بڑی بے رحمی ہے۔ آپ ہائیڈل برگ (Heidel Berg) میں تو ایسی نہیں تھیں۔ شاید ہائیل برون (Heilbronn) کی آب و ہوا نے آپ کو بے مہر بنا دیا ہے۔''[۱۰]

۲ر دسمبر ۱۹۰۷ء کو بھی انہیں لکھا کہ

''میں زیادہ لکھ یا کہہ نہیں سکتا۔ آپ تصوّر کر سکتی ہیں کہ میرے وطن (؟) میں کیا ہے۔ میری بہت بڑی خواہش یہ ہے کہ میں دوبارہ آپ سے بات کر سکوں اور آپ کو دیکھ سکوں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا کروں جو شخص آپ سے دوستی کر چکا ہو، اس کے لئے ممکن نہیں کہ آپ کے بغیر وہ جی سکے۔ براہ کرم میں نے جو لکھا ہے اس کے لئے مجھے معاف فرمایئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس قسم کے اظہارِ جذبات کو پسند نہیں کرتیں۔''[۱۱]

۲۰ر جنوری ۱۹۰۸ء کے مکتوب میں زیادہ واشگاف اظہار ہے مگر تہذیب کے پیرائے میں:

''شاید میرے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ میں دوبارہ آپ کو دیکھ پاؤں۔۔۔۔ لیکن میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ آپ میری زندگی میں ایک حقیقی قوت بن چکی ہیں۔ میں آپ کو کبھی فراموش نہ کروں اور ہمیشہ آپ کے لطف و کرم کو یاد رکھوں گا۔''[۱۲]

۲۷ر جون ۱۹۰۸ء لندن سے واپسی سے قبل اقبال نے مس ایما ویگنیاسٹ کو خط لکھا:

''مت بھولئے گا کہ اگرچہ کئی ملک اور سمندر ہمیں ایک دوسرے سے جُدا کریں گے پھر بھی ہمارے درمیان ایک غیر مرئی رشتہ قائم رہے گا۔ میرے خیالات ایک مقناطیسی قوت کے ساتھ آپ کی طرف دوڑیں گے۔''[۱۳]

حقیقت میں مس ایما کے نام اقبال کا یہ تخلیقی جملہ گوئٹے اور کیٹس کے عشقیہ خطوط کے اعلیٰ ترین فقروں کا ہم پلہ ہے:

''میں اپنی ساری جرمن زبان بھول گیا ہوں لیکن مجھے صرف ایک لفظ یاد

ہے۔۔۔ایما''[۱۴]

۳۰/جولائی ۱۹۱۲ء کو لاہور میں ایما ویگیناست کے والد کی تعزیت کا خط لکھتے ہوئے انہیں اپنے ماضی کے خوبصورت لمحے یاد آجاتے ہیں:

''آپ کو یاد ہوگا کہ گوئٹے نے اپنے لمحۂ موت میں کیا کہا تھا''مزید روشنی'' موت مزید روشنی کی طرف ایک نئی راہ وا کرتی ہے اور ہمیں ان مقامات تک لے جاتی ہے جہاں ہم ابدی حسن وصداقت کے روبرو کھڑے ہوجاتے ہیں، مجھے وہ وقت بخوبی یاد ہے، جب میں نے گوئٹے کی شاعری آپ کے ساتھ پڑھی اور مجھے اُمید ہے کہ آپ کو بھی وہ پُرمسرت ایام یاد ہوں گے، جب ہم روحانی طور سے ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ یہاں تک کہ میں روحانی لحاظ سے آپ کا شریکِ غم ہوں۔''[۱۵]

۳/جون ۱۹۰۸ء کا خط اُن کی جذباتی کیفیت کا عکاس ہے:

''یہ میری بہت بڑی تمنا ہے کہ میں ہندوستان لوٹنے سے پہلے آپ سے ملاقات کرسکوں۔ بے رحم نہ بنیئے، پلیز جلد خط لکھئے اور تمام احوال بتایئے۔ میرا جسم یہاں ہے، میرے خیالات جرمنی میں ہیں۔آج کل بہار کا موسم ہے، سورج مسکرا رہا ہے لیکن میرا دل غمگین ہے۔ مجھے کچھ سطریں لکھئے اور آپ کا خط میری بہار ہوگا۔''[۱۶]

جن خاتون دوستوں کو انہوں نے جذباتی ہوکر خط لکھے، اُن میں عطیہ فیضی اور ایما ویگیناسٹ اہم ہیں۔ عطیہ فیضی کے حوالے سے علامہ اقبال اور مولانا شبلی کے جذبات سے کون واقف نہیں؟ عطیہ فیضی کے نام چند خطوط میں اقبال نے جس طرح کے جذبات کا اظہار کیا ہے یہاں اُن اقتباسات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ۱۷/اپریل ۱۹۰۹ء کو لاہور سے لکھے گئے خط کا ابتدائیہ دیکھیے:

''آپ کے مکتوب نے مجھے انتہائی سکون بخشا ہے۔ میں بھی آپ سے ملنے کا آرزومند ہوں اور اپنے تمام تر وجود کو آپ کے سامنے بے نقاب کردینا چاہتا

ہوں۔آپ فرماتی ہیں کہ آپ مجھ سے بہت سے سوال کرنا چاہتی ہیں۔بسم اللہ! آپ کے خطوط ہمیشہ محفوظ انداز میں رکھتا ہوں، کسی کی اُن تک رسائی نہیں اور آپ جانتی ہیں کہ میں آپ سے کوئی بات چھپاتا نہیں بلکہ ایسا کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔ مجھے تسلیم ہے کہ میرے خط جیسا کہ آپ فرماتی ہیں بالکل طمانیت بخش نہیں لیکن انہی وجوہ کی بنا پر جو آپ نے گزشتہ عنایت نامہ میں بیان کی تھیں، ایسا ہونا ناگزیز تھا۔ مجھے فراموش کاری کا مرتکب نہ گردانیے ۔ یہ میری فطرت کے خلاف ہے۔''[۱۷]

۱۷/جولائی ۱۹۰۹ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''کیا میں نے کبھی آپ کی رہنمائی کی ہے؟ آپ کو آموزش کی احتیاط ہی کب تھی؟ مجھے یاد ہے میں نے افلاطون سے آپ کو روشناس کرایا مگر بات وہیں ختم ہوگئی۔ہم نے اسے اتنا کم پڑھا کہ اس سلسلہ میں آپ کی علمی رہنمائی کے اعزاز کا قرار واقعی دعویٰ نہیں کرسکتا۔

آپ فرماتی ہیں کہ میں آپ کی خواہشات کے عدم احترام کا مرتکب ہوں، یہ واقعی عجیب بات ہے کیوں کہ میں نے تو ہمیشہ آپ کی خواہشات کا احترام ملحوظ رکھا اور آپ کی خوشنودی کے لئے امکان بھر کوشاں رہا ہوں۔البتہ جب کبھی کوئی امر ہی میرے حیطۂ اقتدار سے باہر ہوا تو میں مجبور رہا۔''[۱۸]

۷/اپریل ۱۹۱۰ء کو اقبال نے عطیہ فیضی کے نام ایک طویل خط لکھا جس میں وہ عطیہ فیضی کی کسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے وضاحت کررہے تھے۔قیاس ہے کہ حیدرآباد ریاست سے وظیفہ طلبی کے حوالے عطیہ فیضی نے طعن آمیز پیرایہ اختیار کیا تھا، جس پر وہ لکھتے ہیں:

''ہمارے درمیان جو غلط فہمی ہوئی اس کے متعدد اسباب ہیں اور یہی اسباب غیری شعوری طور پر آپ کے دل و دماغ پر مسلط ہیں اور ان اسباب نے میری شومی قسمت سے آپ کو مجھ سے اس حد تک بدظن کردیا ہے کہ اب آپ مجھ پر دروغ بافی کی تہمت طرازی تک اُتر آئی ہیں اور میرے تعلقات کو خلوص وصداقت

سے معرّا سمجھتی ہیں۔۔۔۔ مائی ڈیر مس عطیہ! میرے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جایئے اور نہ ہی مجھ پر ایسا عتاب فرمایئے جو آپ کے خط سے ٹپک رہا ہے، آپ نے تمام حقیقت تو سنی نہیں۔ آپ کو میری اُن مشکلات کا جو میری روش کا باعث ہوئی ہیں کچھ اندازہ ہی نہیں، میرے روّیہ کی مفصل تشریح ایک طویل خط کی طالب ہے جس کی طوالت ناگواری کی حد تک پہنچ جائے گی اور شاید یہ داستانِ طویل متعدد خطوط کی طالب ہو، اور ایک نیاز نامہ اس کا متحمل نہ ہو سکے۔ مزید براں اس حقیقت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ کاغذ جذباتِ انسانی کی حرارت کا کب متحمل ہوتا ہے، اور کئی امور ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کا ضبطِ تحریر میں لانا مناسب نہیں ہوتا۔''[۱۹]

علامہ اقبال کی شاعری میں عورت کا مقام، مرد کی حاکمیت، ذہنی و عقلی لحاظ سے مرد کی برتری کے بعد ان کے مکتوب میں عورت کے حوالے سے جذباتیت، اپنائیت، محبت کی طلب، اپنا موقف سمجھانے کے لئے لجاحت سے کام لینا، خود اقبال کی تین بیویاں ان کے علاوہ مختلف خواتین سے ربط کا اعتراف اس پہلو کے مطالعے کی دعوت دیتا ہے کہ اقبال ذاتی زندگی میں صنف لطیف کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن غالباً ایک سوشل ریفارمر کی حیثیت سے یا ملکی نظم و نسق یا رہنمائی کے حوالے سے اُسے مرکزیت دینے سے گریزاں ہیں۔ مئی ۱۹۳۵ء میں سردار بیگم والدۂ جاوید کے انتقال کے بعد علامہ کو گھر بار اور بچوں کی دیکھ بھال کی بہت پریشانی تھی۔ ان کی اپنی بیماری نے اس مسئلہ کو اور بھی تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ علی گڑھ کے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی وساطت سے ایک جرمن گورنس ڈورالنٹ کی خدمات حاصل ہو گئیں جو کہ علی گڑھ کے ایک پروفیسر جرمن اہلیہ کی عزیزہ تھیں۔ ایک موقع پر اقبال نے حمید احمد خان کے استفسار پر ڈورالنٹ سے متعلق کہا کہ:

''بیچاری اپنے حالات کی وجہ سے مصیبت میں تھی اور ہے بڑی شریف عورت، بہت اچھی منتظم ہے بچوں کی تعلیم کے علاوہ اس نے گھر کا بہت سا اور کام کاج بھی سنبھال لیا ہے۔ ذرا فرصت ملتی ہے تو مان کے جھاڑنے پونچھنے میں لگ جاتی ہے یا باورچی خانے میں جا کر ہاتھ بٹاتی ہے میرا باورچی خانے کا خرچ اب ایک تہائی کم ہو گیا ہے۔ کبھی انگریزی میں خط لکھنا ہوتا ہے تو اسی کو لکھوا دیتا

ہوں۔''[۲۰]

ایک موقع پر حاجی نواب محمد اسماعیل خان رئیس وتاولی ضلع علی گڑھ کے نام (۱۱/اپریل ۱۹۱۳ء) ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

''میں نے بار بار دیکھا ہے کہ مسلمان مستورات بوجہ جغرافیہ نہ جاننے کے اخبار اچھی طرح سمجھ نہیں سکتیں۔ آپ کا رسالہ اُن کے لئے از بس مفید ہوگا۔ قطع نظر اس کے کہ اُن کو موجودہ دنیا کے واقعات سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے اُن کے دائرہ نظر میں وسعت بھی پیدا ہوگی۔''[۲۱]

گویا نجی یا شخصی زندگی میں عورت کے حوالے سے اقبال کے روّیوں کی معنویت اپنی جگہ، مگر برصغیر پاک و ہند میں نہ صرف ایک مخصوص وقت میں تیز رفتار تبدیلی کی زد میں آنے والے سماج کے ادراک کے سبب اقبال کو اندازہ ہے کہ مسلم عورت کے گرد بڑی دیر تک مردانہ سماج کا روایتی محاصرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ مغربی تہذیب اور تحریکِ نسواں کی بدولت حالات میں اور عورتوں کے مزاج اور طور طریقوں میں جو تبدیلی آ رہی ہے، اس کا اقبال کو بھی احساس ہے اور اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ خواتین کو بذات خود تحریک نسواں شروع کرنے پر اُکساتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک اسلام خود آزادیٔ نسواں کی ایک بہت بڑی ثقافتی تحریک ہے، لیکن یہ آزادی یورپ کی بے حدود آزادی سے مختلف ہے اور توازن و اعتدال سے ہمکنار ہے۔

''یہ تحریک بہت زور سے شروع ہونی چاہیے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ مسلمان عورتیں مسلمان قوم کی بہترین روایات کی حفاظت کر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ اصلاح کا صحیح اور عقلمندانہ راستہ اختیار کریں اور ترکی یا دیگر یورپین ممالک کی عورتوں کی اندھا دھند تقلید کے درپے نہ ہو جائیں۔''[۲۲]

''عورت کو آزادی خود شریعت اسلامی نے دے رکھی ہے، مصطفٰے کمال کیا دیں گے؟ ہاں مدر پدر آزادی کی شریعت اسلامی نے کبھی اجازت نہیں دی۔ نہ کوئی ہوش مند انسان کبھی اس کی خواہش کرے گا۔ بے جا آزادی سے ترکی میں یورپین قسم کا ناچ شروع ہوا۔ اسی مصطفٰے کمال کو وہ ناچ حکماً بند کرنا پڑا۔''[۲۳]

بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان:

''حقیقت میں اقبال کا نقطۂ نظر اس باب میں یہ نہیں کہ وہ عورتوں کی ترقی کے خلاف ہے ہاں وہ ان طریقوں کے خلاف ہے جو آزادئ نسواں کی تحریک نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اختیار کیے ہیں۔''[۲۴]

انہیں اندازہ تھا کہ عالمِ اسلام میں ترکی، مصر اور ایران کے بعد خود ہندوستان میں بھی عورت کے لئے مغربی تمدن کی آزادیاں اور حقوقِ آزادی بہت زیادہ ترغیب پیدا کر رہے ہیں، یورپی استعمار کے منفی اثرات اپنی جگہ مگر ان کے زیرِ استعمال ٹیکنالوجی اور زندگی میں سہولتیں پیدا کرنے والے وسائل ان کی نوآبادیوں میں بھی پُرکشش تبدیلیاں لا رہی تھیں، اس لئے اقبال کو احساس تھا کہ محض مشرقی اقدار اور مذہبی عظمت کے اعلان کے سہارے تبدیلی کے عمل کو روکا نہیں جا سکتا، اس لئے وہ تعلیمِ نسواں کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ عورت کی بنیادی توقیر کو دل سے تسلیم کر کے اس کے لئے مغرب کی بجائے مشرق سے ایسی خواتین تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو نمائندہ ہوں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی طرح فکرِ اقبال پر بھی لوگوں کے جامد اور یک رُخے ذہن نے اپنے اثرات مرتب کئے ہیں۔ اقبال خود جمود کے مخالف تھے لیکن ہمارے یہاں ان کی فکر کو ایک ہی رُخ عطا کیا گیا۔ ان کے اشعار کی معنویت اور شعر خوانی کو ایک ہی زاویے سے پرکھا گیا اور اوہ زاویہ تھا اقبال کو ایسے سوشل ریفارمر کے طور پر پیش کرنا جس کے یہاں جذبات عقل پر فوقیت رکھتے ہوں۔

اقبال کے دور سے لے کر آج تک تہذیب وتمدن میں متنوع تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ دنیا بطور خاص مغرب میں تحریک نسواں بھی عروج پر ہے۔ یقیناً پاکستانی عورت بھی اکیسویں صدی میں قدم رکھ چکی ہے۔ اس کے اردگرد بھی ترقی یافتہ دنیا موجود ہے جس میں وہ اپنا رول ادا کر سکتی ہے۔ پہلے کی نسبت آج مسلم ممالک میں عورتیں بھی ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر، نرس، بینکار، سیاستدان، ماہرین معاشارت وغیرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں اور ظاہر ہے اسلام نے بھی اِس سلسلے میں عورتوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ ویسے بھی آبادی کے آدھے حصے کو معاشی سرگرمیوں سے الگ کر کے معاشی ترقی حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس سلسلے میں اس ذہنی صحت مندی کو پیدا کرنا اور اسے قائم رکھنا ضروری ہے جس کا اقبال تذکرہ کر چکے ہیں۔

آج پاکستانی معاشرہ میں بھی عورت کے متعلق معاشرتی تصورات میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے اگرچہ ہمارے معاشرے میں عورت ابھی روایتی تصورات کے تحت چار دیواری میں بھی زندگی بسر کر رہی ہے تاہم جدید مغربی تہذیب اور میڈیا کے اثرات کی بدولت ایسے طبقات بھی موجود ہیں جن میں عورت سماجی میدانوں میں اپنی خدمات

سرانجام دے رہی ہے اور یقیناً یہ انہی طبقات کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کو جاگیردرانہ سماج اور چار دیواری کی قید سے آزاد کرائیں اور اس کے ساتھ عورت کے حوالے سے جدید تصورات میں توازن بھی پیدا کریں۔ رموز بیخودی کا وہ قصہ پیش نظر رکھنا چاہیے جہاں اقبال یہ کہتے ہیں:

درمصافے پیشِ آں گردوں سریر　　دخترِ سردارِ طے آمد اسیر
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود　　گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید　　چادرِ خود پیشِ روے او کشید

میرے نزدیک ''چادر'' کا تصور دراصل حفظ وحرمت عورت کا تصور ہے یہ احترام اور حفاظت نہ تو چار دیواری میں قید ہوکر حاصل ہوسکتی ہے اور نہ مادر پدر آزادی سے، بلکہ یہ چادر، یہ حفظ وحرمت ان دونوں کے درمیان توازن سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ میرے نزدیک یہی اقبال کے تصورات کی بنیاد بھی ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں اقبال نے ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ سرکار رسالت مآب کے روبرو حاتم کی بیٹی قیدی کے طور پر بے چادر ہوکر کے لائی گئی تو سرکار رسالت مآب نے اسے بے پردہ دیکھا تو اس کے سر پر اپنی چادر اوڑھا دی اس کے بعد کے شعر میں اقبال مناجات کے پیرائے کہتے ہیں:

ما ازاں خاتونِ طَے عریاں تریم
پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
(کلیات اقبال فارسی، ص۲۰)

یعنی آج ہم دنیا میں اس سے بھی زیادہ عریاں ہیں اور رسوا ہو چکے ہیں یہ ایک طرح پاکستانی سماج کمزور طبقات کی فریاد سے مماثل ہے۔ جن کی محرومی پر کسی بھی شعلہ بیاں مقرر کی خطابت پردہ نہیں ڈال سکتی۔

حوالہ جات

۱۔ بحوالہ ''مقالاتِ اقبال'' (ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر)، مرتبہ عبدالواحد معینی، ص: ۱۷۷۔

۲۔ طالب حسین سیال، ''اقبال اور انسان دوستی''، ص ۲۴۴-۲۴۷۔

۳۔ شرف النساء بیگم نواب خان بہادر خاں کی بیٹی تھیں، جو شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں پنجاب کے گورنر تھے۔ ان کے والد یعنی شرف النساء کے دادا نواب عبدالصمد خاں بھی بہادر شاہ بادشاہ کے عہد میں پنجاب کے گورنر رہ چکے تھے، انہوں نے ہی بندہ بہادر کے فتنہ کا استیصال کر کے اسے قید کیا تھا، شہر کے شمال میں اور شالامار باغ کے راستہ میں جہاں اب بیگم پورہ کا گاؤں آباد ہے۔ اس زمانہ میں یہاں نواب کے محلات تھے، نواب عبدالصمد خاں کی بیگم کی طرف منسوب ہو کر اس آبادی کا نام بیگم پورہ پڑ گیا۔ ان دونوں نوابوں کی قبریں اب بھی یہاں موجود ہیں۔

شرف النساء بیگم نے محلات میں ایک چبوترہ بنوا رکھا تھا۔ سیڑھی لگی رہتی تھی۔ بیگم کا معمول تھا کہ نماز فجر کے بعد روزانہ اس چبوترہ پر بیٹھ کر کلام مجید کی تلاوت کرتیں۔ ایک مرصع تلوار پاس رکھی رہتی۔ تلاوت ختم کر چکتیں تو قرآن پاک بند کر کے اس کے پاس تلوار رکھ کر نیچے آ جاتیں۔ مرنے کے بعد وصیّت کے بموجب بیگم کو اسی چبوترہ میں دفن کیا گیا اور قرآن شریف اور تلوار قبر پر رکھ دی گئی۔ (بحوالہ محمد طاہر فاروقی۔ سیرِ اقبال، طبع سوم ۱۹۶۹ء قومی کتب خانہ، لاہور، ص: ۴۳۷۔۴۳۸)

۴۔ بحوالہ ''کلیات مکاتیب اقبال'' جلد اوّل (۱۸۹۹ء تا ۱۹۱۸ء) مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی، اُردو اکادمی، دہلی، اشاعت چہارم ۱۹۹۳ء، ص ۳۳۷۔

۵۔ بحوالہ ''کلیات مکاتیب اقبال''، ص: ۱۰۴۔

۶۔ ''مکاتیب اقبال'' کے مرتب سیّد مظفر برنی نے حاشیے میں لکھا ہے کہ امیر بیگم کا تعلق طوائفوں کے گھرانے سے تھا، اس خاندان کی بیشتر تائب ہو چکی تھیں۔ امیر بیگم فارسی شاعری کا ذوق رکھتی تھیں اور اقبال اسی وجہ سے اُن سے بہت متاثر تھے۔

۷۔ بحوالہ ''کلیات مکاتیب اقبال''، جلد اول، ص: ۲۷

۸۔ .....ایضاً،.....ص: ۱۷۴

۹۔ .....ایضاً،.....ص:۲۶۰

۱۰۔ .....ایضاً،.....ص:۱۳۲-۱۳۳

۱۱۔ .....ایضاً،.....ص:۱۳۶

۱۲۔ .....ایضاً،.....ص:۱۲۹

۱۳۔ .....ایضاً،.....ص:۱۳۷

۱۴۔ .....ایضاً،.....ص:۱۴۵

۱۵۔ .....ایضاً،.....ص:۲۳۶

۱۶۔ .....ایضاً،.....ص:۱۳۵

۱۷۔ .....ایضاً،.....ص:۱۶۷-۱۶۶

۱۸۔ .....ایضاً،.....ص:۱۷۹-۱۷۸

۱۹۔ .....ایضاً،.....ص:۱۹۲-۱۹۱

۲۰۔ سعید راشد، مکالماتِ اقبال، ص:۳۰۵-۳۰۶۔ بک کارنر پبلشرز، جہلم، ۱۹۸۸ء

۲۱۔ بحوالہ ''کلیات مکاتیب اقبال'' جلد اول، ص۲۴۹۔

۲۲۔ بحوالہ ''مقالاتِ اقبال''، (شریعت اسلام میں مرد اور عورت کا رتبہ'') مرتبہ: عبدالواحد معینی، ص۳۲۷

۲۳۔ .....ایضاً.....، ص۳۲۶

۲۴۔ یوسف حسین خان، ڈاکٹر، ''روحِ اقبال''، ۲۴۴